

داستان اشتیاق

میں نے آٹو گراف الیم بند کر دی۔ عذہ میں نظریں آوارہ پھرنے لگیں۔ ذہن البتہ ایک خاص لفظ پر جما ہوا تھا۔ مجھے اس لیے بہت کچھ یاد آیا۔

ایک لڑکے کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ وہ بڑا ہڈیلا اور سر پہرا تھا مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ طبیعت ایسی پانی تھی کہ شرارت کرنے اور سزا پانے میں خوش رہتی۔ ڈانٹ کھا کر فوراً اسی کام میں لگ گیا جس سے اسے منع کیا تھا۔ یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ ڈانٹنے والا رنج ہو کر بولا بھلا تم کب باز آنے والے ہو، تم سے بھلسنات کی امید کون رکھے۔ تم تو احراری ہو احراری۔ یوں میں نے احراری کا لفظ پہلی بار سنا۔ اور اسے بدی کا ایک استعارہ سمجھ لیا۔ چند دنوں بعد میں جب میں نے سنا کہ مولانا محمد علی کو رئیس الاحرار کہتے ہیں۔ اور اقبال کے کلام میں مرد موسیٰ کے ساتھ مردانِ حُر کا ذکر بھی ہے تو اس لفظ کے معنی میں شبہ پیدا ہو گیا۔ اس شبہ کو پیر جو گوٹھ کی گدی سے بڑی تقویت ملی کہ وہاں سبھی حُر کھلاتے ہیں کچھ مدت اور گریزی تو یہ عقدہ کھلا کہ تشبیہ اور استعارے کا درست ہونا ضروری نہیں صرف نادر اور پُر اثر ہونا لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشبیہات اور استعارے کا استعمال ہماری شاعری اور دشنام طرازی میں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچا تو میں نے اشتباہ کو دور کرنے کی کوشش بے سود سمجھ کر ترک کر دی۔ مگر اس کوشش کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ میں نے الفاظ کی درجہ بندی کر لی ہے اور اس طرح بہت سی مشکلات آسان ہو گئی ہیں۔ الفاظ کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک تو وہ لفظ جو ابن الوقت اور مرزا غلام دار بیگ ہوتے ہیں ان کے معنی وقت اور موسم کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ظالم، مظلوم۔ دوسرے وہ معنی خیز لفظ جن کا مطلب علم اور تجربے کے ساتھ واضح اور وسیع ہوتا جاتا ہے مثلاً حسن و عشق، تیسرے وہ تہ دار لفظ ہیں جن کا سادہ اور قطعی مفہوم کبھی گرفت میں نہیں آتا مثلاً عوام اور استعمار۔ اس درجہ بندی کے بعد میں نے احرار کو دشنام کے استعارے سے خارج کیا اور تیسری قسم کے الفاظ میں شامل کر لیا۔ اب مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ جماعت احرار نے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۳ء تک کیا کھویا اور کیا پایا اور لوگ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کم از کم میں کوئی رائے نہیں رکھتا۔ آخر یہ کہاں ضروری ہے کہ انسان ہر موضوع بحث اور ہر اختلافی مسئلہ پر قطعی اور حتمی رائے کا مالک ہو اور اپنے برتاؤ میں اتنا خشک اور درشت ہو جائے کہ احرار کی کھلانے لگے۔

جب میں ملتان میں تعینات ہوا تو صلیح کے اہم افراد کی ایک فہرست پیش ہوئی۔ اس میں سر کردہ افراد بھی تھے اور سرکش اشخاص بھی۔ بڑے سے بڑے ٹوڈی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے باغی کا نام درج تھا۔ ایک نام دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام تھا۔ وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھے۔ اور اس انجمن کا نام مجلس احرار تھا۔ ظفر علی خاں نے اسی مجلس احرار کا قافیہ بیزار، افسرار، غلط کار چندے کے طلبگار اور

رسوا سر بازار سے ملایا تھا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں نے اس شخص کا نام جسے بہت سے لوگ امیر شریعت کہتے ہیں ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ کر لیا۔ ان دنوں الیکشن کے انتظامات کی مصروفیت تھی۔ چند ماہ گزرے تو الیکشن اور آئین دونوں منسوخ ہو گئے۔ مصروفیت زیادہ ہو گئی۔ بنیادی جمہوریت اور زرعی اصلاحات کی پہلی قسط کے ساتھ کسی دوسرے سرکاری اور نیم سرکاری کاموں میں لگا رہا کہ سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ کام معمول پر آیا تو یادداشت سے ایک نقطہ ابھرا اور غلش بن گیا۔ شاہ جی سے ملاقات کی خواہش دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اس کا اظہار منشی عبدالرحمان خاں سے کر دیا۔

مجلس احرار کو غیر قانونی قرار دیئے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے۔ جماعت اپنے انجام کو پہنچی تو گویا جلسہ برخواست ہو گیا۔ نعرے گم، لیڈر او جمل، جلوس منتشر ایک دور تھا کہ ختم ہو گیا اور اس کی صرف دو یاد گاریں رہ گئیں۔ مجلس کی فروگزاشتیں اور میر مجلس کی خطابت۔ شاہ جی ملتان میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ان کی تقریریں کچھ قانون وقت نے بند کر دیں اور کچھ اس قانون قدرت نے جو ہر بورڈھے آدمی پر لاگو ہوتا ہے۔ شاہ جی کی تقریروں کا بڑا چرچا تھا۔ سننے والوں کا بیان ہے کہ عشاء سے فجر ہو جاتی مگر طبیعت سیر نہ ہوتی۔ خوش الحان اور خوش بیان تھے، عربی، فارسی، اردو اور پنجابی محاورے پر قادر تھے۔ قرأت، نثر، نظم، لطیفہ، ہجو، اور تشبیح کو حسب ضرورت استعمال کرتے تھے۔ احتیاط کا دامن اکثر ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور کبھی کبھی اسے دانستہ اپنے ہاتھ ہی سے چاک کر دیتے اور اس بات کی بھی پرواہ نہ کرتے کہ یہ کام برسر عام ہونا ہے یا برسر منبر۔

شاہ جی اپنے زمانے کے سب سے معروف و مشہور مقرر تھے۔ عوام نے انہیں سر آنکھوں پر رکھا اور خواص نے ان سے ہمیشہ ختم کھایا۔ میں نے ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اکثر سنتا رہتا اور سوچتا تھا کہ وہ خطابت کس پائے کی ہوگی۔ جسے مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد اور بہادر پار جنگ کا زمانہ ملا پھر وہ سب پر بھاری رہی۔ مولانا محمد علی، علی گڑھ اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ابوالکلام آزاد اللہ لکھنوی اور امام الہند کھلاتے تھے۔ محمد بہادر خاں نواب اور جاگیر دار تھے۔ شاہ جی کے پاس کیا رکعتہ تاجپوش میں دلخوش تھی، بنارس میں ورق کوٹنے کی مشقت اور امرتسر میں ایک چھوٹی سی مسجد کی امامت۔ اس کے باوجود شاہ جی کو جس نے سنا اس نے یہی کہا۔

چہ جاو نیست ندانم بطرز گفتارش
کہ باز بستہ زبان سنن طرازاں را
(فیضی)

ذاکر صاحب نے مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ابوالکلام آزاد کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند پیش کرنے کے موقع پر کہا تھا کہ اردو زبان کو ہمیشہ اس پر خمر ہے گا کہ وہ آپ کی زبان سے بولی اور آپ کے قلم سے لکھی گئی۔ اردو نے جب بھی اپنے سرمایہ افتخار پر ناز کیا تو اسے بہت سے لوگ یاد آئیں گے۔ ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل ہونگے۔ جن کے لئے سیاست دراصل ایک اسٹیج، سیاسی جماعتیں صرف منتقلین جلسہ، ملک بھر کی آبادی محض سامعین اور زندگی ایک طویل اردو تقریر تھی۔ اس خطیبانہ زندگی میں ان کے ہم عصر تو

بہت تھے مگر ہمسر کوئی نہ تھا۔

عرصہ ہوا میں نے شاہ جی کو ایک بار کراچی میں سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مجھے یہ فکر تھا کہ جلسہ رات گئے ختم ہوا تو وہاں کسی کی بس نہیں ملے گی۔ اتنے میں صابطہ فوجداری حرکت میں آیا۔ جلسہ منسوخ ہو گیا اور شاہ جی غالباً پکڑے گئے بے بسی کی جگہ محرومی نے لے لی۔ یہ اوائل ملازمت کی بات ہے جب شاہ جی کے بولنے اور ہمارے سننے کے دن تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ خطابت کی راہ میں پیری حاصل ہونے لگی اور سماعت کی راہ میں ملازمت کے آداب اور صابطہ حاصل ہونے لگے۔ آج اگر تقریر نہ سنی تو کل کیسے سن سکیں گے جب ہم اس نظام کا حصہ بن چکے ہوں گے جہاں حسن انتظام کا معیار صرف یہ ہے کہ کسی مخالفت کی تقریر نہ ہونے پائے۔ تقریر کا جواب تقریر سے دینے میں محنت صرف ہوتی ہے۔ اور یہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ گول باغ اور موجی گیٹ میں پانی چھوڑ دیا جائے۔

شاہ جی کی تقریر سے محروم رہا تو تقریب بہر ملاقات نکال لی۔ یہ ملاقات منشی عبدالرحمان خاں کے ذمہ تھی۔ انہوں نے شاہ جی سے بات کی تو وہ مثال گئے۔ کہنے لگے کہ میں ساری عمر انتظامیہ سے لڑتا آیا ہوں۔ ڈپٹی کمشنر اگر بلانا چاہے تو وارنٹ گرفتاری نکالے۔ منشی صاحب نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کھما دیکھتے ہوئی نا احراریوں والی بات۔ یہ ان کی مرضی کہ وہ عہدے کو انتظامیہ کی علامت جانتے ہیں اور انتظامیہ کو ہر حال میں قابل ملازمت سمجھتے ہیں مگر یہ کہاں کی بالغ نظری ہے کہ عہدے اور عہدہ دار کے فرق سے بھی انکار کر دیا جائے۔ اگر مجھے ان کی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تو انہیں میری ملازمت سے کیا غرض۔ ایک نوجوان دور حاضر کے عظیم خطیب سے ملنے کا خواہشمند ہے اور بوڑھا خطیب اس کے اشتیاق کا حال پوچھتا ہی نہیں۔ بس اتنا سہی کر کہ وہ سرکاری ملازم ہے اسے فوراً رد کر دیتا ہے۔ رہا حفظ مراتب کا سوال تو میں نے پہلے ہی شاہ جی سے حاضری کی اجازت چاہی تھی سلام نہیں بھیجا تھا۔ پیغام بر نے یہ باتیں سنیں اور اسٹے پاؤں واپس لوٹ گیا۔ اگلے ہی روز سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرے یہاں مہمان بن کر کشریف لے آئے میں نے نئے مٹھکا کار کا دروازہ کھولا۔ پہلے ایک پھر مٹھکا ہوا غارسی شعر برآمد ہوا اور اس کے چپھے شعر پڑھنے والا اترا۔ ڈھیلا ڈھالا کھدر کا کرتا، سبز چار خانہ نہ بند، دیسی جوتی، درازد اور دراز ریش، کشادہ جبیں اور خندہ رو، شاہ جی نے ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا دوسرے سے کچھ بوجھ اپنے عصا پر ڈالا۔ کھر ذرا سی خم ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر گیلری سے ہوتے ہوئے بال کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ کمرے کے دوسرے سرے تک چلتے گئے اور وہاں پہنچ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ جوتی اتاری اور پالتی مارلی۔ میں نے انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھا اور ان کی پرانی تصویروں کو یاد کیا۔ دونوں میں تصویر سی مشابہت ضرور ہے مگر مناسبت کوئی نہیں۔ کہاں وہ لیم لیم گیسو دراز اور عصا بردار جسے دیکھ کر دیو جالس کھلی، برنارڈ شا، ٹیگور اور ٹالسٹائی یاد آتے تھے اور کہاں یہ ستا ہوا بے وزن ڈھانچا جو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے شاہ جی سے اپنے اشتیاق کا قصہ بیان کیا۔ ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اتنی سنی ہے کہ زبان خلق پر ایمان لے آیا ہوں۔ جس نے ان کی تقریر سنی اور پسند کی اس کے لئے علم حاضر اور

جس نے کبھی نہ سنی مگر اوروں سے زیادہ متاثر ہوا اس کے لئے ایمان بالغیب۔ شاہ جی نے میری بات کا اعتبار اور میرے جذبات کا احترام کیا وہ ذرا سی دیر میں یوں گھل مل گئے گویا میری نیاز مندی کو ایک زمانہ بیت چکا ہو۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو ان کی بیماری اور کمزوری کے پیش نظر میں نے اسے طول دینے سے احتراز کیا مگر جب باتیں ختم ہوئیں تو شام ہو چکی تھی۔ اور شاہ جی کو آنے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ گفتگو کا سلسلہ کمر بھر کے لئے بھی منقطع نہ ہوا اور اس میں میرا حصہ اسی قدر تھا جتنا ایک میرزا باں اور ساح کا ہونا چاہیے۔ منشی صاحب محض سننے اور سر دھننے کے قائل نہیں ان کا اصول ہے کہ اچھا انسان، اچھی کتاب اور اچھی گفتگو جہاں میسر آئے اس میں دوسروں کو بھی شریک کرو۔ ان سے تنہا فائدہ اٹھانا حکمِ ظفر کی دلیل ہے۔ ملاقات شروع ہوئی تو منشی صاحب مسکرا رہے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئے پھر کاغذ لکلا اور یادداشت لکھنے میں مشغول ہو گئے وہ جو ایک نوجوان اور تھوڑا سا تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ چائے دو تین بار آئی مگر یوں دے پاؤں کہ گفتگو میں کوئی خلل نہ پڑا۔ ان تین گھنٹوں میں شاہ جی نے آیات، احادیث، اشار اور چشموں سے ایک جادو جگائے رکھا۔ میں ان کی خطابت کا راز جاننا چاہتا تھا مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ موضوع اتنی تیزی سے بدلتے رہے کہ خطابت پر حجم نہ رہا۔ گفتگو شاہ جی کی صحت سے شروع ہوئی اور توکل سے ہوتی ہوئی سیرت تک پہنچی۔ وہاں تاریخ کا ذکر آگیا اور اس میں مختلف ترکیبیں شامل ہو گئیں۔ ہر ترکیب کے ساتھ اس سے وابستہ افراد کا جائزہ شروع ہو گیا۔ اور بات ایک پورا چکر لگا کر شاہ جی کی ذات پر واپس آ گئی۔ اس مرحلے پر شاہ جی نے واپس جانے کی اجازت چاہی ملاقات ختم ہونے والی تھی۔ اس وقت شاہ جی جو تیاں اتارے صوفے پر اکڑوں بیٹھے تھے ابھی وہ پیر نیچے اتاریں گے چڑھی ہوئی آستین بھی نیچے اترے گی۔ گلے کا بٹن بند ہو گا۔ پان کی ڈبیر جیب میں ڈالی جائے گی اور پھر عصا کا سہارا لے کر اٹھیں گے جو تمام عرصہ ان کے ہاتھ ہی میں رہا تھا میں نے کہا اجازت ہو تو چند سوال پوچھ لوں اجازت ملی تو میں نے دو سوالوں سے تمہید باندھی اور جواب ملنے پر تیسرا سوال داغ دیا۔ اس سوال و جواب کے دو سال بعد میں نے منشی صاحب کو خط لکھا کہ لہجہ تحریری یادداشت مجھے بھیج دیں۔ منشی صاحب نے بہت ڈھونڈا مگر ایک مختصر ورق کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ وہ گفتو جے میں نے محفوظ سمجھا تھا اس کے الفاظ گم ہو گئے۔ اگرچہ اس کا حاصل حافظے میں محفوظ ہے۔ اور اس کا تاثر دل پر نقش ہے۔ مشاہیر کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے سلسلے میں حافظ پر زیادہ اعتبار کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ حافظ بھی خواہشات کا تابع ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات خواب و خیال کو واقعات اور واردات میں منتقل کر دیتا ہے۔ ایسے میں اس کا کہنا مانیں تو نفس اور تاریخ دونوں کا زیاں ہوتا ہے۔

میں نے شاہ جی سے جو سوال کئے وہ سب سو دو زیاں کے بارے میں تھے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ گزشتہ چالیس برس میں جو آپ کی عوامی زندگی پر محیط ہیں آپ نے بر عظیم کے مسلمانوں کو اسلام سے قریب آتے ہوئے دیکھا ہے۔ یا دور جاتے ہوئے پایا ہے۔ جواب ملا کہ مسلمانوں میں دو طبقے پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں ایک مذہب سے قریب دوسرا اس سے کچھ دور۔ ان دونوں طبقوں کا درمیانی فاصلہ اس چالیس سال میں بہت بڑھ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو لوگ مذہب سے بیگانہ ہیں ان کی تعداد اور قوت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ میں

نے دوسرا سوال پوچھا۔ بر عظیم کی گزشتہ چالیس سالہ تاریخ میں زندگی کے کتنے ہی شعبوں میں ایسے نامور مسلمان ایک ہی وقت میں جمع ہو گئے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر ان سب کی موجودگی میں اسلام سے بیگانہ ہو جانے والوں کی تعداد اور قوت میں اضافہ ہوا ہے تو اس مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس کے مسائل آپ کے عہد سے زیادہ الجھے ہوئے اور رہنما آپ کے معیار سے کم یا یہ ہوں گے۔ کیا یہ بات قابل افسوس نہیں کہ جو ملی سربراہ آپ کو اسلاف سے ملتا تھا اس سے آپ کا ترکہ کمتر ہو گا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ ہمیں اپنے مقصد میں اس لئے کامیابی نہ ہو سکی کہ دوسو برس کے عرصے میں فرنگی کی تعلیم اور تہذیب نے اپنا پورا تسلط جما لیا تھا۔ آسودہ حال لوگ علی گڑھ کی طرف چلے گئے اور ناکارہ آدمی دینی مدارس کے حصے آئے۔ جنگ آزادی کی ہمدی میں سیاست دین پر اور منافقت دنیا پر غالب آئی۔ ساری توجہ اور توانائی نئی تعلیم اور نئی سیاست کی نذر ہو گئی۔ جو لوگ باقی رہے ان میں سے کچھ ہندو تمدن کے زیر اثر رہ کر گمراہ ہو گئے صرف بچے کچھے اور لٹے پٹے لوگ ہی دین کے کالے میں شامل ہوئے۔ ہمارا سربراہ خوب تامل کرنا خوب تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے آج بھی وہ شے بھی کھو اپنی کھائی بھی گنواؤ اور مستقبل کو بھی محذووش بنادیا۔ میں نے آخری سوال کی اجازت چاہی اور اسے دو طرح سے پوچھا ایک شکل یہ تھی کہ اگر قیامت کے دن آپ سے پوچھا گیا کہ اسے وہ شخص جسے بیان و کلام میں چالیس کروڑ افراد پر فوقیت دی گئی تھی اس خطابت کا حساب پیش کرو تو آپ ناکام تحریکوں کے حلوہ کیا پیش کریں گے۔ اسی سوال کی دوسری شکل یہ تھی کہ آپ نے اپنی جدوجہد کا انجام دیکھ لیا اب اگر زمانہ چالیس برس پیچھے لوٹ جائے تو آپ اپنی خطابت اور طاقت کا دوبارہ وہی استعمال کریں گے یا آپ کی زندگی بالکل نئی ہو گی۔ شاہ جی یکایک خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی میں آزدگی بھی شامل تھی۔ میں نے موضوع بدل دیا اور اپنی آٹو گراف الہم ان کے سامنے کر دی شاہ جی نے اسے پہلو پر رکھا اور لکھا:

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اول اول

وہ بجھتی سی چٹھاریاں آخر آخر

قیامت کا طوفان صرا میں اول

غبارِ رہ کارواں آخر آخر

چمن میں عنادل کا مسبود اول

اور گیاہ رہ گلِ رھاں آخر آخر

ان تین اشعار کے نیچے ایک طویل محکش کے ساتھ سید لکھا اور سید کے اوپر عطاء اللہ بخاری لکھ کر دستخط مکمل کر دیئے۔ یہ بات ۲۸ جون ۱۹۵۹ء کی ہے۔ دو تین برس بعد میں اور منشی عبدالرحمن خاں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ شاہ جی زندہ تھے تو اپنے سامعین کو کبھی بنبر زمین کبھی صرا اور کبھی قبریں کبھ کر پکارتے تھے۔ آج ہم ان کے سہرا بنے خاموش کھڑے تھے۔ قبر سے آواز آئی۔ تمہارے تیسرے سوال کا جواب اس روز نہ دے سکتا تو آج سنو، الفاظ اقبال کے ہیں قصہ مسلم ہندی کا اور حاصل ایک عمر کی خطابت کا:

مسلم ہندی چڑا سیدان گزشت ہمت او بوئے کراری نداشت!
مشت خاکش آہنباں مر دیدہ سرد گری آواز من کارے نہ کرد!